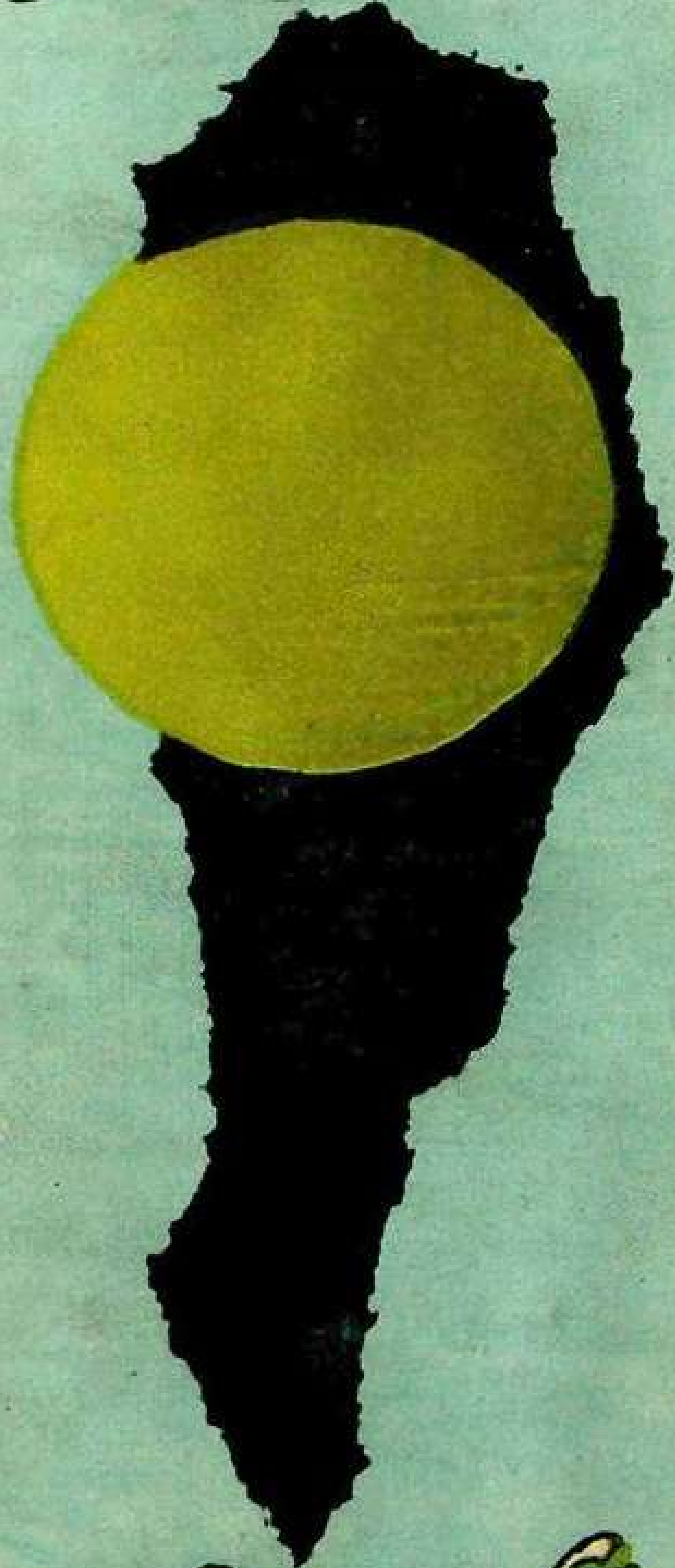
ساحر



آؤ کہ کوئی خواب بنیں

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں

آؤ
کہ
کوئی
خواب
بنیں

ساحر لدھیانوی

ناشر : پنجابی پستک بھنڈار
دریبہ کلاں، دہلی ۶
پہلا ایڈیشن : اگست ۱۹۷۱ء
دوسرا ایڈیشن : مئی ۱۹۷۳ء
قیمت : آٹھ روپے
مطبع : یونین پریس دہلی

حرفِ آغاز

زیرِ نظر مجموعہ فہرست کے اعتبار سے بتیس ۳۲ منظومات پر مشتمل ہے، ان میں سے انتیس ۲۹ منظومات ایسی ہیں جو پہلی بار کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔ باقی تین نظموں میں ایک نظم "پرچھائیاں" ہے، جو پہلے الگ کتابچے کی صورت میں شائع ہوئی تھی، بعد میں اسے "تلخیاں" ہی میں شامل کر دیا گیا۔ چنانچہ "تلخیاں" کا چودھواں اور پندرھواں ایڈیشن اس نظم سمیت شائع ہوا۔ بعد کے چھ ایڈیشنوں میں جو پاکٹ بک سیریز میں چھپے، صفحات کی پابندی کے باعث یہ نظم شامل نہ ہو سکی۔ اس وقت یہ نظم نہ تلخیاں میں شامل ہے، نہ الگ کتابچے کی شکل میں موجود ہے۔

یوں سمجھنا چاہیئے کہ کئی سال کے وقفے کے
بعد یہ نظم اس مجموعے کے ذریعے قارئین
تک دوبارہ پہنچ رہی ہے۔ دوسری دو نظمیں
"مرے عہد کے حسینو!" اور "خون پھر خون ہے"
"تلخیاں" کے بعض ایڈیشنوں میں شامل رہی
ہیں مگر نئے ایڈیشن میں شامل نہیں کی
جا رہی ہیں ۔۔۔ انہیں زیرِ نظر مجموعے
میں اس لئے شامل کیا گیا ہے کیوں کہ
ان کا لہجہ "تلخیاں" کی نظموں کی نسبت،
اس مجموعے کی نظموں سے زیادہ ہم آہنگ
ہے۔

بمبئی،
۱۷ اپریل ۱۹۷۳ء

ساحر

ترتیب

قطعہ ۱۱
قطعہ ۱۲
آؤ کہ کوئی خواب بُنیں ۱۳
بہت گھٹن ہے ۱۵
مرے عہد کے حسینو! ۱۷
قطعات ۲۰
ایک ملاقات ۲۱
اب آئیں یا نہ آئیں ۲۳
ہم عصر ۲۴
خون پھر خون ہے ۲۷
لب پہ پابندی تو ہے ۳۰
جواہر لال نہرو ۳۲
اے شریف انسانو! ۳۶



کیوں ہو ؟ ۴۱

اہلِ دل اور بھی ہیں ۴۲

۲۶ ؍ جنوری ۴۴

جشنِ غالبؔ ۴۷

میں زندہ ہوں ۵۰

گاندھی ہو یا غالبؔ ہو ۵۲

دیکھا ہے زندگی کو ۵۴

لینن ۵۶

صدیوں سے ۶۰

اے نئی نسل ! ۶۲

نئے ہیں کچھ نہیں ۶۷

دل ابھی ـــــ ! ۶۸

یہ زمیں جس قدر ـــــ ! ۷۰

بڑی طاقتیں ۷۲

لشکرکشی ۷۲

ـــــ مگر ظلم کے خلاف ۷۳

توڑ لیں گے ہر اک شے سے رشتہ ۷۵

بات کریں ۷۷

پرچھائیاں ۷۹ سے ۱۰۳

خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عمر

ساحر

نہ مُنہ چھُپا کے جیے ہم، نہ سر جھُکا کے جیے
ستمگروں کی نظر سے نظر مِلا کے جیے
اب ایک رات اگر کم جیے، تو کم ہی سہی
یہی بہت ہے کہ ہم مشعلیں جلا کے جیے



وجہِ بے رنگیٔ گلزار کہوں تو کیا ہو
کون ہے کتنا گنہگار کہوں تو کیا ہو
تم نے جو بات سرِ بزم نہ سننا چاہی
میں وہی بات سرِ دار کہوں تو کیا ہو

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں، کل کے واسطے
ورنہ یہ رات، آج کے سنگین دَور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عُمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بُن سکیں

گو ہم سے بھاگتی رہی یہ تیز گام عُمر
خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عُمر

زلفوں کے خواب، ہونٹوں کے خواب، اور بدن کے خواب
معراجِ فن کے خواب، کمالِ سخن کے خواب
تہذیبِ زندگی کے، فروغِ وطن کے خواب
زنداں کے خواب، کوچۂ دار و رسن کے خواب

یہ خواب ہی تو اپنی جوانی کے پاس تھے
یہ خواب ہی تو اپنے عمل کی اساس تھے
یہ خواب مر گئے ہیں تو بے رنگ ہے حیات
یوں ہے کہ جیسے دستِ تہہِ سنگ ہے حیات

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں، کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دَور کی،
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بُن سکیں

۲۰۰

بہت گھٹن ہے

بہت گھٹن ہے کوئی صورتِ بیاں نکلے
اگر صدا نہ اُٹھے، کم سے کم فغاں نکلے

فقیرِ شہر کے تن پر لباس باقی ہے
امیرِ شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

حقیقتیں ہیں سلامت تو خواب بہتیرے
ملال کیوں ہو جو کچھ خواب رائیگاں نکلے

وہ فلسفے جو ہر اک آستاں کے دشمن تھے
عمل میں آئے تو خود وقفِ آستاں نکلے

اُدھر بھی خاک اُڑی ہے، اُدھر بھی زخم پڑے
جدھر سے ہو کے بہاروں کے کارواں نکلے
ستم کے دور میں ہم اہلِ دل ہی کام آئے
زباں پہ ناز تھا جن کو وہ بے زباں نکلے

مِرے عہد کے حسینو!

وہ ستارے جن کی خاطر کئی بیقرار صدیاں
مری تیرہ بخت دنیا میں ستارہ وار جاگیں
کبھی رفعتوں پہ لپکیں، کبھی وسعتوں سے اُلجھیں
کبھی سوگوار سوئیں، کبھی نغمہ بار جاگیں

وہ بلند بام تارے، وہ فلک مقام تارے
جو نشان دے کے اپنا، رہے بے نشاں ہمیشہ
وہ حسیں، وہ نور زادے، وہ خلا کے شاہزادے
جو ہماری قسمتوں پر رہے حکمراں ہمیشہ

جنھیں مضمحل دلوں نے ابدی پناہ جانا
تھکے ہارے قافلوں نے جنھیں خضرِ راہ جانا
جنھیں کمسنوں نے چاہا کہ لپک کے پیار کر لیں
جنھیں مہوشوں نے مانگا کہ گلے کا ہار کر لیں
جنھیں عاشقوں نے چاہا کہ فلک سے توڑ لائیں
کسی راہ میں بچھائیں، کسی سیج پہ سجائیں
جنھیں بتگروں نے چاہا کہ صنم بنا کے پوجیں
یہ جو دور کے حسیں ہیں، انھیں پاس لا کے پوجیں
جنھیں مطربوں نے چاہا کہ صداؤں میں پرو لیں
جنھیں شاعروں نے چاہا کہ خیال میں سمو لیں
جو ہزار کوششوں پر بھی شمار میں نہ آئے
کبھی خاکِ بے بضاعت کے دیار میں نہ آئے
جو ہماری دسترس سے رہے دور دور اب تک
ہمیں دیکھتے رہے ہیں جو بصد غرور اب تک

مرے عہد کے حسینو! وہ نظر نواز تارے
مرا دورِ عشق پرور تمھیں نذر دے رہا ہے

وہ جنوں جو آب و آتش کو اسیر کر چکا تھا
وہ خلا کی وسعتوں سے بھی خراج لے رہا ہے

مرے ساتھ رہنے والو! مرے بعد آنے والو!
مرے دَور کا یہ تحفہ تمہیں سازگار آئے
کبھی تم خلا سے گزرو کسی سیمتن کی خاطر
کبھی تم کو دل میں رکھ کر کوئی گلعذار آئے

(اسپتنک کی ایجاد پر)

قطعات

تپتے دل پر یوں گرتی ہے
تیری نظر سے پیار کی شبنم
جلتے ہوئے جنگل پر جیسے
برکھا برسے رُک رُک تھم تھم

جہاں جہاں تری نظروں کی اوس ٹپکی ہے
وہاں وہاں سے ابھی تک غبار اُٹھتا ہے
جہاں جہاں ترے جلووں کے پھول بکھرے تھے
وہاں وہاں دلِ وحشی پکار اُٹھتا ہے

ایک مُلاقات

تری تڑپ سے نہ تڑپا تھا میرا دل، لیکن
ترے سکون سے بیچین ہو گیا ہوں میں
یہ جان کر تجھے کیا جانے، کتنا غم پہنچے
کہ آج تیرے خیالوں میں کھو گیا ہوں میں

کسی کی ہو کے تو اِس طرح میرے گھر آئی
کہ جیسے پھر کبھی آئے تو گھر ملے نہ ملے

نظر اٹھائی، مگر ایسی بے یقینی سے
کہ جس طرح کوئی پیشِ نظر ملے نہ ملے
تو مسکرائی، مگر مسکرا کے رُک سی گئی
کہ مسکرانے سے غم کی خبر ملے نہ ملے
رُکی تو ایسے کہ جیسے تری ریاضت کو
اب اِس ثمر سے زیادہ ثمر ملے نہ ملے
گئی تو سوگ میں ڈوبے قدم یہ کہہ کے گئے
سفر ہے شرط، شریکِ سفر ملے نہ ملے

تری تڑپ سے نہ تڑپا تھا میرا دل، لیکن
ترے سکون سے بیچین ہو گیا ہوں میں
یہ جان کر تجھے کیا جانئے، کتنا غم پہنچے
کہ آج تیرے خیالوں میں کھو گیا ہوں میں

اب آئیں یا نہ آئیں

اب آئیں یا نہ آئیں اِدھر، پوچھتے چلو
کیا چاہتی ہے ان کی نظر پوچھتے چلو

ہم سے اگر ہے ترکِ تعلّق، تو کیا ہُوا
یارو! کوئی تو ان کی خبر پوچھتے چلو

جو خود کو کہہ رہے ہیں کہ منزل شناس ہیں
ان کو بھی کیا خبر ہے، مگر پوچھتے چلو

کس منزلِ مُراد کی جانب رواں ہیں ہم
اے رہروانِ خاک بسر پوچھتے چلو

ہم عصر

تو بھی کچھ پریشاں ہے
تو بھی سوچتی ہو گی
تیرے نام کی شہرت، تیرے کام کیا آئی

میں بھی کچھ پشیماں ہوں
میں بھی غور کرتا ہوں
میرے کام کی عظمت، میرے کام کیا آئی

تیرے خواب بھی سُونے
میرے خواب بھی سُونے
تیری میری شہرت سے
تیرے میرے غم دُونے

تُو بھی اِک سُلگتا بَن
میں بھی اِک سُلگتا بَن
تیری قبر تیرا فن
میری قبر میرا فن

اب تجھے میں کیا دونگا
اب مجھے تُو کیا دے گی
تیری میری غفلت کو
زندگی سزا دے گی

تُو بھی کچھ پریشاں ہے
تُو بھی سوچتی ہو گی
تیرے نام کی شہرت، تیرے کام کیا آئی

میں بھی کچھ پشیماں ہوں
میں بھی غور کرتا ہوں
میرے کام کی عظمت، میرے کام کیا آئی

خون پھر خون ہے

"...... ایک مقتول لوممبا، ایک زندہ لوممبا سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے"۔
جواہر لال نہرو

ظلم پھر ظلم ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

خاکِ صحرا پہ جمے یا کفِ قاتل پہ جمے
فرقِ انصاف پہ یا پائے سلاسل پہ جمے
تیغِ بیداد پہ، یا لاشۂ بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں
خون خود دیتا ہے جلادوں کے مسکن کا سراغ
سازشیں لاکھ اُڑھاتی رہیں ظلمت کا نقاب
لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ

ظلم کی قسمتِ ناکارہ و رسوا سے کہو
جبر کی حکمتِ پرکار کے ایما سے کہو
محملِ مجلسِ اقوام کی لیلیٰ سے کہو
خون دیوانہ ہے دامن پہ لپک سکتا ہے
شعلۂ تند ہے، خرمن پہ لپک سکتا ہے

تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آنکلا ہے
کہیں شعلہ، کہیں نعرہ، کہیں پتھر بن کر

خون چلتا ہے تو رُکتا نہیں سنگینوں سے
سر اُٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے

ظلم کی بات ہی کیا، ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے آغاز سے انجام تلک
خون پھر خون ہے، سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے

لب پہ پابندی تو ہے

لب پہ پابندی تو ہے، احساس پر پہرا تو ہے
پھر بھی اہلِ دل کو احوالِ بشر کہنا تو ہے

خونِ اعدا سے نہ ہو، خونِ شہیداں ہی سے ہو
کچھ نہ کچھ اس دَور میں رنگِ چمن نکھرا تو ہے

اپنی غیرت بیچ ڈالیں، اپنا مسلک چھوڑ دیں
رہنماؤں میں بھی کچھ لوگوں کا یہ منشا تو ہے

ہے جنہیں سب سے زیادہ دعویٰ حُبِ وطن
آج ان کی وجہ سے حُبِّ وطن رسوا تو ہے

بجھ رہے ہیں ایک ایک کر کے عقیدوں کے دیئے
اس اندھیرے کا بھی لیکن سامنا کرنا تو ہے

جھوٹ کیوں بولیں فروغِ مصلحت کے نام پر
زندگی پیاری سہی، لیکن ہمیں مرنا تو ہے

جواہر لال نہرو

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مِٹ جانے سے انسان نہیں مر جاتے
دھڑکنیں رُکنے سے ارمان نہیں مر جاتے
سانس تھم جانے سے اعلان نہیں مر جاتے
ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مر جاتے
جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

وہ جو ہر دین سے منکر تھا، ہر اک دھرم سے دُور
پھر بھی ہر دین، ہر اک دھرم کا غمخوار رہا

ساری قوموں کے گناہوں کا کڑا بوجھ لئے
عُمر بھر صورتِ عیسیٰ جو سرِ دار رہا

جس نے انسانوں کی تقسیم کے صدمے جھیلے
پھر بھی انساں کی اخوّت کا پرستار رہا

جس کی نظروں میں تھا اک عالمی تہذیب کا خواب
جس کا ہر سانس نئے عہد کا معمار رہا

جس نے زردار معیشت کو گوارا نہ کیا
جس کو آئینِ مساوات پہ اصرار رہا

اس کے فرمانوں کی، اعلانوں کی تعظیم کرو
راکھ تقسیم کی، ارمان بھی تقسیم کرو

موت اور زیست کے سنگم پہ پریشاں کیوں ہو
اُس کا بخشا ہوا سہ رنگ علَم لے کے چلو

جو تمہیں جادۂ منزل کا پتہ دیتا ہے
اپنی پیشانی پہ وہ نقشِ قدم لے کے چلو

دامنِ وقت پہ اب خون کے چھینٹے نہ پڑیں
ایک مرکز کی طرف دیر و حرم لے کے چلو

ہم مِٹا ڈالیں گے سرمایہ و محنت کا تضاد
یہ عقیدہ، یہ ارادہ، یہ قسم لے کے چلو

وہ جو ہمراز رہا، حاضر و مستقبل کا
اس کے خوابوں کی خوشی، روح کا غم لے کے چلو

جسم کی موت، کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مِٹ جانے سے انسان نہیں مرجاتے
دھڑکنیں رکنے سے ارمان نہیں مرجاتے
سانس تھم جانے سے اعلان نہیں مرجاتے
ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مرجاتے

مئی سنہ ۱۹۶۴ء

اے شریف انسانو

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی اور
معاہدۂ تاشقند کی سال گرہ پر نشر کی گئی۔

خون اپنا ہو یا پرایا ہو،
نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امنِ عالم کا خون ہے آخر

بم گھروں پر گریں، کہ سرحد پر
روحِ تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے

ٹینک آگے بڑھیں، کہ پیچھے ہٹیں
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میتّوں پہ روتی ہے

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دیگی
آگ اور خون آج بخشیگی
بھوک اور احتیاج کل دیگی

اس لئے اے شریف انسانو!
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

۲

برتری کے ثبوت کی خاطر
خوں بہانا ہی کیا ضروری ہے
گھر کی تاریکیاں مِٹانے کو
گھر جلانا ہی کیا ضروری ہے

جنگ کے اور بھی تو میداں ہیں
صرف میدانِ کشت و خوں ہی نہیں
حاصلِ زندگی خرد بھی ہے
حاصلِ زندگی جنوں ہی نہیں

آؤ اس تیرہ بخت دنیا میں
فکر کی روشنی کو عام کریں
امن کو جن سے تقویت پہنچے
ایسی جنگوں کا اہتمام کریں

جنگ، وحشت سے، بربریت سے
امن، تہذیب وارتقا کے لیے
جنگ، مرگ آفریں سیاست سے
امن، انسان کی بقا کے لیے

جنگ، افلاس اور غلامی سے
امن، بہتر نظام کی خاطر
جنگ، بھٹکی ہوئی قیادت سے
امن، بے بس عوام کی خاطر

جنگ، سرمایے کے تسلّط سے
امن، جمہور کی خوشی کے لئے
جنگ، جنگوں کے فلسفے کے خلاف
امن، پُرامن زندگی کے لئے

کیوں ہو؟

کل کے پھولوں سے تھا جس کا رشتہ آج کے غنچہ چینوں میں کیوں ہو
سال خوردہ ایاغوں کی تلچھٹ، نوجواں آبگینوں میں کیوں ہو

ساعتِ فصلِ گل ہے جوانی، کیوں نہ جشنِ مے و ہوش ہو
عاقبت کے عذابوں کا رونا، اِن مبارک مہینوں میں کیوں ہو

بُغض کی آگ، نفرت کے شُعلے میکشوں تک پہنچنے نہ پائیں
فصل یہ مندروں، مسجدوں کی، میکدوں کی زمینوں میں کیوں ہو

اہلِ دل اور بھی ہیں

اہلِ دل اور بھی ہیں، اہلِ وفا اور بھی ہیں
ایک ہم ہی نہیں، دنیا سے خفا اور بھی ہیں

ہم پہ ہی ختم نہیں مسلکِ شوریدہ سری
چاکِ دل اور بھی ہیں، چاکِ قبا اور بھی ہیں

کیا ہُوا گر مرے یاروں کی زبانیں چپ ہیں
میرے شاہد، مرے یاروں کے سوا اور بھی ہیں

سر سلامت ہے تو کیا سنگِ ملامت کی کمی
جان باقی ہے تو پیکانِ قضا اور بھی ہیں
منصفِ شہر کی وحدت پہ نہ حرف آجائے
لوگ کہتے ہیں کہ اربابِ جفا اور بھی ہیں

۲۶ر جنوری

آؤ کہ آج غور کریں اس سوال پر
دیکھے تھے ہم نے جو وہ حسیں خواب کیا ہوئے

دولت بڑھی تو ملک میں افلاس کیوں بڑھا
خوش حالئ عوام کے اسباب کیا ہوئے

جو اپنے ساتھ ساتھ چلے کوئے دار تک
وہ دوست، وہ رفیق، وہ احباب کیا ہوئے

کیا مول لگ رہا ہے شہیدوں کے خون کا
مرتے تھے جن پہ ہم وہ سزایاب کیا ہوئے

بے کس برہنگی کو کفن تک نہیں نصیب
وہ وعدہ ہائے اطلس و کمخواب کیا ہوئے

جمہوریت نواز، بشر دوست، امن خواہ
خود کو جو خود دیئے تھے وہ القاب کیا ہوئے

مذہب کا روگ آج بھی کیوں لاعلاج ہے
وہ نسخہ ہائے نادر و نایاب کیا ہوئے

ہر کوچہ شعلہ زار ہے، ہر شہر قتل گاہ
یکجہتیِ حیات کے آداب کیا ہوئے

صحرائے تیرگی میں بھٹکتی ہے زندگی
اُبھرے تھے جو اُفق پہ وہ مہتاب کیا ہوئے

مُجرم ہوں میں اگر، تو گنہگار تم بھی ہو
اے رہبرانِ قوم خطاکار تم بھی ہو

جشنِ غالبؔ

اکیس برس گذرے آزادیٔ کامل کو
تب جا کے کہیں ہم کو غالبؔ کا خیال آیا
تربت ہے کہاں اسکی، مسکن تھا کہاں اسکا
اب اپنے سخن پرور ذہنوں میں سوال آیا

سو سال سے جو تربت چادر کو ترستی تھی
اب اس پہ عقیدت کے پھولوں کی نمائش ہے
اردو کے تعلق سے کچھ بھید نہیں کھلتا
یہ جشن، یہ ہنگامہ، خدمت ہے کہ سازش ہے

جن شہروں میں گونجی تھی غالبؔ کی نوا برسوں
اُن شہروں میں اب اُردو بے نام و نشاں ٹھہری
آزادیٔ کامل کا اعلان ہؤا جس دن
معتوب زباں ٹھہری، غدّار زباں ٹھہری

جس عہدِ سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی
اُس عہدِ سیاست کو مرحوموں کا غم کیوں ہے
غالبؔ جسے کہتے ہیں، اُردو ہی کا شاعر تھا
اُردو پہ ستم ڈھا کر غالبؔ پہ کرم کیوں ہے

یہ جشن، یہ ہنگامے، دلچسپ کھلونے ہیں
کچھ لوگوں کی کوشش ہے، کچھ لوگ بہل جائیں
جو وعدۂ فردا پر اب ٹل نہیں سکتے ہیں
ممکن ہے کہ کچھ عرصہ اِس جشن پہ ٹل جائیں

یہ جشن مبارک ہو، پر یہ بھی صداقت ہے
ہم لوگ حقیقت کے احساس سے عاری ہیں
گاندھی ہو کہ غالب ہو، انصاف کی نظروں میں
ہم دونوں کے قاتل ہیں، دونوں کے پجاری ہیں

(فروری ۱۹۶۹ء)

میں زندہ ہوں

میں زندہ ہوں یہ مشتہر کیجیے
مرے قاتلوں کو خبر کیجیے

'زمیں سخت ہے' آسماں دُور ہے'
بسر ہو سکے تو بسر کیجیے

ستم کے بہت سے ہیں ردِّ عمل
ضروری نہیں چشم تر کیجیے

وہی ظُلم بارِ دگر ہے تو پھر
وہی جُرم بارِ دگر کیجیے

قفس توڑنا بعد کی بات ہے
ابھی خواہشِ بال و پر کیجیے

گاندھی ہو یا غالبؔ ہو

(گاندھی شتابدی اور غالبؔ صدی کے اختتام پر لکھی گئی۔)

گاندھی ہو یا غالبؔ ہو
ختم ہُوا دونوں کا جشن
آؤ، انہیں اب کردیں دفن
ختم کرو تہذیب کی بات
بند کرو کلچر کا شور
ستیہ، اہنسا، سب بکواس
تم بھی قاتل، ہم بھی چور
ختم ہُوا دونوں کا جشن
آؤ، انہیں اب کردیں دفن

وہ بستی، وہ گاؤں ہی کیا؟ جس میں ہریجن ہوں آزاد
وہ قصبہ، وہ شہر ہی کیا؟ جو نہ بنے احمد آباد[۱]
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ، انہیں اب کر دیں دفن

گاندھی ہو، یا غالب ہو دونوں کا کیا کام یہاں
اب کے برس بھی قتل ہوئے ایک کی شکشا، اک کی زباں
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ، انہیں اب کر دیں دفن

(فروری ۱۹۷۰ء)

۱؎ اس سال کے بدترین فرقہ وارانہ فساد کی طرف اشارہ ہے۔

دیکھا ہے زندگی کو

دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنا قریب سے
چہرے تمام لگنے لگے ہیں عجیب سے

اے رُوحِ عصر جاگ، کہاں سو رہی ہے تو
آواز دے رہے ہیں پیمبر صلیب سے

اس رینگتی حیات کا کب تک اٹھائیں بار
بیمار اب اُلجھنے لگے ہیں طبیب سے

ہر گام پر ہے مجمعِ عشاق منتظر
مقتل کی راہ ملتی ہے کوئے حبیب سے

اس طرح زندگی نے دیا ہے ہمارا ساتھ
جیسے کوئی نباہ رہا ہو رقیب سے

لینن

(۱۹۱۷ء)

طبقوں میں بٹی دنیا صدیوں سے پریشاں تھی
غمناکیاں رِستی تھیں آباد خرابوں سے

عیش ایک کا لاکھوں کی غربت سے پنپتا تھا
منسوب تھی یہ حالت، قدرت کے حسابوں سے

اخلاق پریشاں تھا، تہذیب ہراساں تھی
'بدکار' حضوروں' سے، 'بدنسل' جنابوں' سے

عیّارِ سیاست نے ڈھانپا تھا جرائم کو
اربابِ کلیسا کی حکمت کے نقابوں سے
انساں کے مقدّر کو آزاد کیا تُو نے
مذہب کے فریبوں سے شاہی کے عذابوں سے

لینن

(۱۹۷۰ء)

کیا جانیں، تری اُمّت کس حال کو پہنچے گی
بڑھتی چلی جاتی ہے تعداد اماموں کی
ہر گوشۂ مغرب میں، ہر خطّۂ مشرق میں
تشریح دگرگوں ہے اب تیرے پیاموں کی
وہ لوگ جنہیں کل تک دعویٰ تھا رفاقت کا
تذلیل پہ اُترے ہیں، اپنوں ہی کے ناموں کی

بگڑے ہوئے تیور ہیں تو عمرِ سیاست کے
بپھری ہوئی سانسیں ہیں تو مشق نظاموں کی
طبقوں سے نکل کر ہم فرقوں میں نہ بٹ جائیں
بن کر نہ بگڑ جائے تقدیر غلاموں کی

لینن کی سوویں سالگرہ
۲۴ر اپریل سنہ ۱۹۷۰ء

صدیوں سے

صدیوں سے انسان یہ سنتا آیا ہے
دکھ کی دھوپ کے آگے، سُکھ کا سایا ہے

ہم کو اِن سستی خوشیوں کا لوبھ نہ دو
ہم نے سوچ سمجھ کر غم اپنایا ہے

جھوٹ تو قاتل ٹھہرا، اس کا کیا رونا
سچ نے بھی انساں کا خون بہایا ہے

پیدائش کے دن سے موت کی زد میں ہیں
اس مقتل میں کون ہمیں لے آیا ہے

اوّل اوّل جس دل نے برباد کیا
آخر آخر وہ دل ہی کام آیا ہے

اُتنے دن احسان کیا دیوانوں پر
جتنے دن لوگوں نے ساتھ نبھایا ہے

اے نئی نسل!

۲۲ نومبر ۱۹۷۰ء کو مصنّف کی پرانی درسگاہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ کی گولڈن جوبلی منائی گئی، اس موقع پر کالج کی طرف سے مرکزی وزیرِ تعلیم ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ نے مصنّف کو گولڈ میڈل پیش کیا۔ مصنّف نے یہ نظم اسی تقریب کے لئے لکھی اور اسے کالج کے پرنسپل پریتم سنگھ صاحب کے نام منتسب کیا۔

(ادارہ)

میرے اجداد کا وطن یہ شہر
میری تعلیم کا جہاں یہ مقام
میرے بچپن کی دوست، یہ گلیاں
جن میں رسوا ہوا شباب کا نام
یاد آتے ہیں اِن فضاؤں میں
کتنے نزدیک اور دُور کے نام
کتنے خوابوں کے ملگجے چہرے
کتنے یادوں کے سرمگیں اجسام

کتنے ہنگامے، کتنی تحریکیں
کتنے نعرے جو تھے زبانِ زدِ عام

میں یہاں جب شعور کو پہنچا
اجنبی قوم کی تھی قوم غلام
یونین جیک درسگاہ پہ تھا
اور وطن میں تھا سامراجی نظام
اسی مٹی کو ہاتھ میں لے کر
ہم بنے تھے بغاوتوں کے امام
یہیں جانچے تھے دھرم کے وشواس
یہیں پرکھے تھے دین کے اوہام
یہیں منکر بنے روایت کے
یہیں توڑے رواج کے اصنام

یہیں نکھرا تھا ذوقِ نغمہ گری
یہیں اُترا تھا شعر کا الہام
میں جہاں بھی رہا، یہیں کا رہا
مجھ کو بھولے نہیں ہیں یہ در و بام
نام میرا جہاں جہاں پہنچا
ساتھ پہنچا ہے اس دیار کا نام
میں یہاں میزباں بھی، مہماں بھی
آپ جو چاہیں دیجئے مجھے نام
نذر کرتا ہوں اِن فضاؤں کی
اپنا دل، اپنی روح، اپنا کلام

اور فیضانِ علم جاری ہو
اور اونچا ہو اِس دیار کا نام

اور شاداب ہو یہ ارضِ حسیں
اور مہکے یہ وادیِ گلفام
اور اُبھریں صنم گری کے نقوش
اور چھلکیں مئے سخن کے جام
اور نکلیں وہ بے نوا، جن کو
اپنا سب کچھ کہیں وطن کے عوام
قافلے آتے جاتے رہتے ہیں
کب ہُوا ہے یہاں کسی کا قیام
نسل در نسل کام جاری ہے
کارِ دنیا کبھی ہُوا نہ تمام

کل جہاں میں تھا، آج تُو ہے وہاں
اے نئی نسل! تجھکو میرا سلام

نَے میں کچھ نہیں

نغمہ جو ہے تو روح میں ہے، نَے میں کچھ نہیں
گر تجھ میں کچھ نہیں، تو کسی شے میں کچھ نہیں

تیرے لہُو کی آنچ سے گرمی ہے جسم کی
مے کے ہزار وصف سہی، مے میں کچھ نہیں

جس میں خلوصِ فکر نہ ہو، وہ سخن فضول
جس میں نہ دل شریک ہو اس لَے میں کچھ نہیں

کشکولِ فن اٹھا کے سُوئے خسرواں نہ جا
اب دستِ اختیارِ جَم و کَے میں کچھ نہیں

دل ابھی ــــــ!

زندگی سے اُنس ہے
حُسن سے لگاؤ ہے
دھڑکنوں میں آج بھی
عشق کا الاؤ ہے
دل ابھی بجھا نہیں

رنگ بھر رہا ہوں میں
خاکۂ حیات میں
آج بھی ہوں منہمک
فکرِ کائنات میں
غم ابھی لُٹا نہیں

حرفِ حق عزیز ہے
ظُلم ناگوار ہے
عہدِ نَو سے آج بھی
عہد، استوار ہے
میں ابھی مرا نہیں

یہ زمیں جس قدر — !

یہ زمیں جس قدر سجائی گئی
زندگی کی تڑپ بڑھائی گئی

آئینے سے بگڑ کے بیٹھ گئے
جن کی صورت جنہیں دکھائی گئی

دشمنوں ہی سے بیر نبھ جائے
دوستوں سے تو آشنائی گئی

نسل در نسل انتظار رہا
قصرِ ٹوٹے، نہ بے نوائی گئی

زندگی کا نصیب کیا کہیے
ایک، سیتا تھی جو ستائی گئی

ہم نہ اوتار تھے، نہ پیغمبر
کیوں یہ عظمت ہمیں دلائی گئی

موت پائی صلیب پر ہم نے
عمر بَن باس میں بتائی گئی

بڑی طاقتیں

تم ہی تجویزِ صلح لاتے ہو
تم ہی سامانِ جنگ بانٹتے ہو
تم ہی کرتے ہو، قتل کا ماتم
تم ہی تیر و تفنگ بانٹتے ہو

لشکر کشی

فوج حق کو کچل نہیں سکتی
فوج چاہے کسی یزید کی ہو
لاش اٹھتی ہے پھر عَلم بن کر
لاش چاہے کسی شہید کی ہو

— مگر ظلم کے خلاف

ہم امن چاہتے ہیں مگر ظلم کے خلاف
گر جنگ لازمی ہے، تو پھر جنگ ہی سہی

ظالم کو جو نہ روکے، وہ شامل ہے ظلم میں
قاتل کو جو نہ ٹوکے، وہ قاتل کے ساتھ ہے
ہم سر بکف اٹھے ہیں کہ حق فتح یاب ہو
کہہ دو اُسے جو لشکرِ باطل کے ساتھ ہے
اس ڈھنگ پر ہے زور، تو یہ ڈھنگ ہی سہی

ظالم کی کوئی ذات، نہ مذہب نہ کوئی قوم
ظالم کے لب پہ ذکر بھی اِن کا گناہ ہے
پھلتی نہیں ہے شاخِ ستم اس زمین پر
تاریخ جانتی ہے زمانہ گواہ ہے
کچھ کور باطنوں کی نظر تنگ ہی سہی

یہ زر کی جنگ ہے نہ زمینوں کی جنگ ہے
یہ جنگ ہے بقا کے اصولوں کے واسطے
جو خون ہم نے نذر دیا ہے زمین کو
وہ خون ہے گلاب کے پھولوں کے واسطے
پھوٹے گی صبحِ امن، لہو رنگ ہی سہی

(دسمبر ۱۹۷۱ء)

توڑ لیں گے ہر اک شئے سے رشتہ

توڑ لیں گے ہر اک شے سے رشتہ توڑ دینے کی نوبت تو آئے
ہم قیامت کے خود منتظر ہیں، پر کسی دن قیامت تو آئے

ہم بھی سقراط ہیں عہدِ نو کے، تشنہ لب ہی نہ مر جائیں یارو
زہر ہو یا مئے آتشیں ہو، کوئی جامِ شہادت تو آئے

ایک تہذیب ہے دوستی کی، ایک معیار ہے دشمنی کا
دوستوں نے مروّت نہ سیکھی، دشمنوں کو عداوت تو آئے

رِند رستے میں آنکھیں بچھائیں، جو کہے بن سُنے مان جائیں
ناصحِ نیک طینت کسی شب سُوئے کوئے ملامت تو آئے

علم و تہذیب، تاریخ و منطق، لوگ سوچیں گے اِن مسئلوں پر
زندگی کے مشقّت کدے میں کوئی عہدِ فراغت تو آئے

کانپ اٹھیں قصرِ شاہی کے گنبد، تھرتھرائے زمیں معبدوں کی
کوچہ گردوں کی وحشت تو جاگے، غمزدوں کو بغاوت تو آئے

بات کریں

سزا کا حال سنائیں، جزا کی بات کریں
خدا ملا ہو جنھیں وہ خدا کی بات کریں

انھیں پتہ بھی چلے اور وہ خفا بھی نہ ہوں
اِس احتیاط سے کیا مدّعا کی بات کریں

ہمارے عہد کی تہذیب میں قبا ہی نہیں
اگر قبا ہو تو بندِ قبا کی بات کریں

ہر ایک دَور کا مذہب نیا خدا لایا
کریں تو ہم بھی مگر کس خدا کی بات کریں

وفا شعار کئی ہیں، کوئی حسیں بھی تو ہو
چلو پھر آج اُسی بے وفا کی بات کریں

پرچھائیاں

(ایک طویل نظم)

دیباچہ

ایک اچھی نظم کی خصوصیات وہی ہیں جنھیں غالبؔ نے حُسن کی کیفیت بیان کرنے کے لئے چار لفظوں میں ادا کیا ہے۔ "سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری" اِن چاروں کیفیات کا امتزاج مشکل ہے لیکن جب یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے تو نظم ایک مکمل پیکرِ حُسن بن کر سامنے آتی ہے اور دلوں کو موہ لیتی ہے۔

ساحرؔ نے ایک سادہ سی کہانی کو جو بارہا ہم نے سُنی ہے اور دیکھی ہے اور محسوس کی ہے اور نظر انداز کی ہے، اپنی رنگین بیانی اور آتش بیانی سے پُرکیف بنا دیا ہے۔ اسکی سادگی، اس کے موضوع اور مواد میں ہے اور پُرکاری اس تکنیک میں جو شاعر نے استعمال کی ہے۔ بیخودی اس مکمل ہم آہنگی سے پیدا ہوئی ہے جو شاعر کو اپنے موضوع سے ہے اور اس بیخودی کے عالم میں بھی اس کے سماجی شعور نے اُسے ہشیار رکھا ہے۔ اگر یہ ہشیاری نہ ہوتی تو رنگین بیانی میں آتش بیانی کی آمیزش نہ ہو سکتی اور نظم کا آخری حصہ نہ لکھا جاتا۔

"پرچھائیاں" ساحرؔ کی بیشتر نظموں کی طرح محاکات کا ایک اچھا نمونہ ہے اور بیک وقت غنائی اور بیانیہ کیفیات کی حامل ہے۔ وہ غنائی کیفیت جو بیانیہ عناصر سے آنکھ چُراتی ہے۔ بسا اوقات ذاتی داخلیت کے نہاں خانوں میں جلوے دکھا کر رہ جاتی ہے اور وہ بیانیہ کیفیت جو غنائی عناصر سے گریز کرتی ہے ایک طرح کی ظاہر نگاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کی مثال "نہر پہ چل رہی ہے پن چکی" سے بہتر نہیں ملتی۔ ساحرؔ کی یہ نظم اُس کی پوری شاعری کی طرح اِن دونوں عیوب سے پاک ہے۔

اس محاکاتی کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے ساحرؔ نے لفظوں کے استعمال میں بھی بڑی خوش مذاقی دکھائی ہے۔ اس نے بعض مقامات پر نقّاشی اور رنگ کاری کا کام لیا ہے اور

وہاں اس کا قلم شاعر کے قلم کے بجائے مصوّر کا موقلم بن گیا ہے۔ الفاظ جو چند حروف کی اجتماعی شکلیں ہیں پگھل کر رنگ اور خطوط میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور کاغذ کے صفحہ پر ایک منظر کھینچ دیتے ہیں۔ ان کی صوتی کیفیت میں ٹکراؤ اور جھنکار کے بجائے ایک خاموش اور بے آواز روانی ہے جیسے صاف اور چکنی سطح پر آہستہ آہستہ پانی بہہ رہا ہو۔

میں نے "پرچھائیاں" پڑھنے سے پہلے اس نظم کو مختلف جلسوں اور مشاعروں میں ساحر کی زبان سے کئی بار سُنا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ اس کی اثر آفرینی کسی ایک طبقے یا گروہ تک محدود نہیں ہے۔

اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی اور بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ اس کا موضوع اس عہد کا سب سے اہم سوال ہے جس کا جواب ساری انسانیت کو دینا ہے اور "عالمی امن تحریک" اس پر شاہد ہے کہ اس کا جواب ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل، ہر طبقے، ہر مکتبِ خیال کے آدمی نے ایک ہی طرح دیا ہے۔ دنیا کی نصف سے زائد آبادی نے امنِ عالم کے محضر پر اپنی مہر ثبت کی ہے۔ ساحر لدھیانوی نے یہ خوبصورت نظم لکھ کر اپنے دستخط کئے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ساحر نے اپنی بات ایک کہانی کی شکل میں کہی ہے اور کہانی نظم کو زیادہ عام فہم بنا دیتی ہے۔ ہماری بعض بہترین نظمیں عام انسانوں کی سمجھ کی سطح سے بہت اونچی ہیں لیکن ساحر کی نظم "پرچھائیاں" اپنی سادہ کہانی اور آسان بیانی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وسیع حلقوں تک پہونچ سکے گی۔ اس کے نوّے فیصدی سے بھی کچھ زیادہ الفاظ ہماری روزمرّہ گفتگو کے الفاظ ہیں۔ کلاسکیت اور روایت کے نام پر ساحر نے اپنی نظم کو اجنبی اور غیر مانوس الفاظ سے بوجھل نہیں بنایا ہے۔ ساحر کی کامیابی اس میں ہے کہ اس نے اپنے سادہ اور آسان الفاظ سے اس عہد کی بعض اہم حقیقتوں کو ایسے مصرعوں میں ڈھال دیا ہے جو زبان پر چڑھ بھی جاتے ہیں اور دل پر اثر بھی کرتے ہیں۔ مثلاً جب وہ یہ کہتا ہے کہ "اس دور میں جینے کی قیمت یا دارورسن یا خواری ہے۔" تو وہ ایک مصرعے میں وہ سب

کچھ سمیٹ لینا ہے جو ایک پوری کتاب کا موضوع ہے۔ یہی تاثر اور گہرائی اس شعر میں ہے۔

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا ؎ کہ جب جوان ہوں بچّے تو قتل ہو جائیں

اسی انداز سے اس نے اتنے بے پناہ اور اچھوتے مصرعے بھی کہے ہیں۔ جیسے ؎

سنگین حقائق زاروں میں خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں!

اس نظم میں کہانی کہنے کی تکنیک بھی نئی ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اس سے پہلے یہ تکنیک کسی اردو شاعر نے استعمال نہیں کی اور میں جتنا غور کرتا ہوں اتنے ہی مجھے اس تکنیک کے وسیع تر امکانات نظر آتے ہیں۔ یہ تکنیک ساحر نے براہِ راست فلم سے لی ہے جس میں وہ کئی سال سے ایک کامیاب گیت لکھنے والے شاعر کی طرح کام کر رہا ہے۔ وہ ایک طرف خوبصورت اور کامیاب گیت لکھ رہا تھا اور دوسری طرف غالباً غیر شعوری طور سے ایک نئی تکنیک کو آہستہ آہستہ پروان چڑھا رہا تھا جس نے اب "پرچھائیاں" نظم کا روپ اختیار کیا ہے۔

یہ کہانی ایک پُرسکون چاندنی رات کے منظر سے شروع ہوتی ہے جس میں کہانی کا مرکزی کردار جو ایک دکھے ہوئے دل اور لٹی ہوئی زندگی کا فنکار ہے۔ دو محبت کرنے والوں کو دیکھتا ہے اور اس طرح اُس کی یادوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ؎

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح

یہاں اس کی کھوئی ہوئی محبّت کی بہت سی تصویریں یکے بعد دیگرے اس کے ذہن کے پردے پر اُبھرتی ہیں اور کھو جاتی ہیں۔ ہر دو تصویروں کے بیچ میں ایک تخیلی جست ہے۔ جس میں پڑھنے والا شاعر کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔ تصویروں کا یہ سلسلہ کامیاب محبت کے دلکش لمحوں تک پہونچ کر ختم ہو جاتا ہے اور بحر کی تبدیلی کے ساتھ ایک نئے منظر کا آغاز ہوتا ہے جس میں گردو پیش کی زندگی، جنگ اور قحط اور افلاس کے سیلاب میں ڈوب جاتی ہے جس میں مکھن سی ملائم راہیں، چرخوں کی صدائیں، چوپال کی رونقیں، پھولوں کی قبائیں غارت

ہو جاتی ہیں اور وفا شعار عورتوں کے پاکیزہ جسموں کی تجارت شروع ہو جاتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت بنگال کے قحط میں یہی سب کچھ ہوا تھا۔

یہ عام زندگی کی تصویر جو ایک سیلاب کی سی کیفیت کے ساتھ اُبھری تھی، ختم ہوتی ہے تو مرکزی کردار یعنی لٹے ہوئے فنکار کی محبوبہ کی دردناک تصویروں کا سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے۔ نظم کی پہلی بحر پھر واپس آجاتی ہے اور تصورات کی پرچھائیاں بھیانک ہو کر ذہن کے پردے سے گذرنے لگتی ہیں اور اس منزل پر پہونچ کر ختم ہوتی ہیں جہاں "کسی کا کوئی نہیں آج سب اکیلے ہیں"۔

یہاں پھر بحر بدلتی ہے اور سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام اُبھرتی ہے جہاں فنکار کی محبوبہ اپنی ساری پاکیزگی کے باوجود بک چکی ہے اور فن کار روٹی کے چند ٹکڑے حاصل کرنے کے لئے در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے اور اپنی زندگی اور محبوبہ کی عصمت اور دونوں کے پیار کو نہیں بچا سکتا اور اس تلخ تجربے سے گذرنے کے بعد وہ اس منزل پر پہلی بار یہ محسوس کرتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور اس کیوں کا جواب وہ بڑی ایمانداری اور خلوص سے دیتا ہے۔

مجبور رہوں میں، مجبور رہو تم، مجبور یہ دنیا ساری ہے
اس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے
میں دار و رسن تک جا نہ سکا، تم جہد کی حد تک آ نہ سکیں
ہم تم دو ایسی روحیں ہیں، جو منزلِ تسکیں پا نہ سکیں

یہاں ساحر نے بڑی فن کاری سے اس ذلیل زندگی اور اس کے نظام کو بدلنے کے لئے جہد و پیکار کا ولولہ انگیز پیام دیا ہے۔

یہیں سے ساحر کی رنگین بیانی آتش بیانی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور نظم کا آخری حصّہ شروع ہو جاتا ہے جس میں لٹا ہوا فنکار نئے محبّت کرنے والوں کی نازک زندگیوں کو جنگ، قحط اور افلاس سے بچانے کا عہد کرتا ہے اور ساری دنیا کو اس منحوس جنگ کے خلاف منظّم کرنے کی تلقین کرتا ہے ۔

ہمارا پیار حوادث کی تاب لا نہ سکا
مگر انھیں تو مرادوں کی رات مِل جائے
ہمیں تو کشمکشِ مرگِ بے اماں ہی ملی
انھیں تو جھومتی گاتی حیات مل جائے

اور اس تیسری جنگ کے خطرے کے سامنے جو ایٹمی ہتھیاروں سے لڑی جائے گی اُسے نئی محبّت کرنے والی روحیں ہی نہیں بلکہ اپنی تنہائیاں اور اپنے تصوّرات کی پرچھائیاں بھی غیر محفوظ معلوم ہوتی ہیں اور وہ پچھلی جنگوں اور آنے والی جنگ کا تقابل اس طرح کرتا ہے ؎

گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

اس طرح نظم اس ذاتی تاثر کی سطح پر واپس آجاتی ہے جس سے شروع ہوئی تھی نظم کا یہ خاتمہ بیحد خوبصورت اور موثر ہے۔ ساحر لدھیانوی نے اس نظم کے ذریعے اُردو کی طویل نظموں اور امنِ عالم کے ادب میں ایک خوبصورت اضافہ کیا ہے۔

آج دیوالی کی رات ہے اور ہندوستان کے در و بام چراغوں سے جگمگا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ساحر کی نظم امنِ عالم کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد دے گی اور دلوں کو امن اور محبّت کے چراغوں سے جگمگا دے گی۔

سردار جعفری

جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسیں پتّیاں، حسیں فضائیں
لچک رہی ہیں کسی جسمِ نازنیں کی طرح
فضا میں گھل سے گئے ہیں افق کے نرم خطوط
زمیں حسین ہے، خوابوں کی سرزمیں کی طرح
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت، کبھی یقیں کی طرح

وہ پیڑ جن کے تلے ہم پناہ لیتے تھے
کھڑے ہیں آج بھی ساکت کسی امیں کی طرح

اُنھیں کے سائے میں پھر آج دو دھڑکتے دل
خموش ہونٹوں سے کچھ کہنے سننے آئے ہیں
نہ جانے کتنی کشاکش سے کتنی کاوش سے
یہ سوتے جاگتے لمحے چُرا کے لائے ہیں

یہی فضا تھی، یہی رُت، یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبّت کی ابتدا کی تھی
دھڑکتے دل سے، لرزتی ہوئی نگاہوں سے
حضورِ غیب میں ننھّی سی اِلتجا کی تھی
کہ آرزو کے کنول کھل کے پھول ہو جائیں
دل و نظر کی دعائیں قبول ہو جائیں

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

تم آ رہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر
نظر جھکائے ہوئے اور بدن چُرائے ہوئے
خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی ڈرتی
خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رُخ پر
ندی کے ساز پہ ملّاح گیت گاتا ہے
تمھارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے
مری کھُلی ہوئی باہوں میں جھول جاتا ہے
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

میں پھول ٹانک رہا ہوں تمھارے جوڑے میں
تمھاری آنکھ مسرت سے جھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خشک ہے آواز رکتی جاتی ہے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

مرے گلے میں تمھاری گداز باہیں ہیں
تمھارے ہونٹوں پہ میرے لبوں کے سائے ہیں
مجھے یقین، کہ ہم اب کبھی نہ بچھڑیں گے
تمھیں گمان کہ ہم مل کے بھی پرائے ہیں
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

مرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو
ادائے عجز و کرم سے اٹھا رہی ہو تم

سہاگ رات جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں
دبے سُروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

وہ لمحے کتنے دلکش تھے، وہ گھڑیاں کتنی پیاری تھیں
وہ سہرے کتنے نازک تھے، وہ لڑیاں کتنی پیاری تھیں
بستی کی ہر اک شاداب گلی، خوابوں کا جزیرہ تھی گویا
ہر موجِ نفس، ہر موجِ صبا، نغموں کا ذخیرہ تھی گویا

ناگاہ لہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں
بارود کی بوجھل بُو لے کر، پچھّم سے ہوائیں آنے لگیں
تعمیر کے روشن چہرے پر تخریب کا بادل پھیل گیا
ہر گاؤں میں وحشت ناچ اُٹھی، ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

مغرب کے مہذّب ملکوں سے کچھ خاکی وردی پوش آئے
اِٹھلاتے ہوئے مغرور آئے لہراتے ہوئے مدہوش آئے

خاموش زمیں کے سینے میں، خیموں کی طنابیں گڑنے لگیں
مکھّن سی ملائم راہوں پر، بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں

فوجوں کے بھیانک بینڈ تلے، چرخوں کی صدائیں ڈوب گئیں
جیپوں کی سُلگتی دھول تلے، پھولوں کی قبائیں ڈوب گئیں

انسان کی قیمت گرنے لگی، اجناس کے بھاؤ چڑھنے لگے
چوپال کی رونق گھٹنے لگی، بھرتی کے دفاتر بڑھنے لگے

بستی کے سجیلے شوخ جواں، بن بن کے سپاہی جانے لگے
جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے، اس راہ پہ راہی جانے لگے

ان جانے والے دستوں میں غیرت بھی گئی، برنائی بھی
ماؤں کے جواں بیٹے بھی گئے، بہنوں کے چہیتے بھائی بھی

بستی پہ اُداسی چھانے لگی، میلوں کی بہاریں ختم ہوئیں
آموں کی لچکتی شاخوں سے جھولوں کی قطاریں ختم ہوئیں
دھول اُڑنے لگی بازاروں میں، بھوک اُگنے لگی کھلیانوں میں
ہر چیز دکانوں سے اٹھ کر، روپوش ہوئی تہہ خانوں میں
بدحال گھروں کی بدحالی، بڑھتے بڑھتے جنجال بنی
مہنگائی بڑھ کر کال بنی، ساری بستی کنگال بنی
چرواہیاں رستہ بھول گئیں، پنہاریاں پنگھٹ چھوڑ گئیں
کتنی ہی کنواری ابلائیں، ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑ گئیں

افلاس زدہ دہقانوں کے، ہل بیل بکے، کھلیان بکے
جینے کی تمنا کے ہاتھوں، جینے ہی کے سب سامان بکے
کچھ بھی نہ رہا جب بکنے کو، جسموں کی تجارت ہونے لگی
خلوت میں بھی جو ممنوع تھی، وہ جلوت میں جسارت ہونے لگی

تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

تم آرہی ہو سرِ عام بال بکھرائے
ہزار گونہ ملامت کا بار اٹھائے ہوئے
ہوس پرست نگاہوں کی چیرہ دستی سے
بدن کی جھینپتی عریانیاں چھپائے ہوئے

تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

میں شہر جا کے ہر اک در پہ جھانک آیا ہوں
کسی جگہ مری محنت کا مول مِل نہ سکا
ستمگروں کے سیاسی قمار خانے میں
الم نصیب فراست کا مول مِل نہ سکا

تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

تمھارے گھر میں قیامت کا شور برپا ہے
محاذِ جنگ سے ہرکارہ "تار" لایا ہے
کہ جس کا ذکر تمھیں زندگی سے پیارا تھا
وہ بھائی "نرغۂ دشمن" میں کام آیا ہے
تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

ہر ایک گام پہ بدنامیوں کا جمگھٹ ہے
ہر ایک موڑ پہ رسوائیوں کے میلے ہیں
نہ دوستی، نہ تکلّف، نہ دلبری، نہ خلوص
کسی کا کوئی نہیں، آج سب اکیلے ہیں
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

وہ رہگذر جو مرے دل کی طرح سُونی ہے
نہ جانے تم کو کہاں لے کے جانے والی ہے

تمھیں خرید رہے ہیں ضمیر کے قاتل
اُفق پہ خونِ تمنّائے دل کی لالی ہے
تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے
اس شام مجھے معلوم ہوا کھیتوں کی طرح اِس دنیا میں
سہمی ہوئی دوشیزاؤں کی مسکان بھی بیچی جاتی ہے
اس شام مجھے معلوم ہوا، اِس کارگہِ زرداری میں
دو بھولی بھالی روحوں کی پہچان بھی بیچی جاتی ہے

اس شام مجھے معلوم ہوا جب باپ کی کھیتی چھن جائے
ممتا کے سنہرے خوابوں کی انمول نشانی بکتی ہے

اس شام مجھے معلوم ہوا، جب بھائی جنگ میں کام آئیں
سرمائے کے قحبہ خانے میں بہنوں کی جوانی بکتی ہے
سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

تم آج ہزاروں میل یہاں سے دور کہیں تنہائی میں
یا بزمِ طرب آرائی میں
میرے سپنے بنتی ہوگی، بیٹھی آغوش پرائی میں

اور میں سینے میں غم لے کر دن رات مشقت کرتا ہوں
جینے کی خاطر مرتا ہوں
اپنے فن کو رسوا کر کے اغیار کا دامن بھرتا ہوں

مجبور ہوں میں، مجبور ہو تم، مجبور یہ دنیا ساری ہے
تن کا دکھ من پر بھاری ہے
اس دور میں جینے کی قیمت، یا دار و رسن یا خواری ہے

میں دار و رسن تک جا نہ سکا، تم جہد کی حد تک آ نہ سکیں
چاہا تو مگر اپنا نہ سکیں
ہم تم دو ایسی روحیں ہیں جو منزلِ تسکیں پا نہ سکیں

جینے کو جیے جاتے ہیں مگر، سانسوں میں چتائیں جلتی ہیں
خاموش وفائیں جلتی ہیں
سنگین حقائق زاروں میں، خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں

اور آج جب ان پیڑوں کے تلے پھر دو سائے لہرائے ہیں
پھر دو دل ملنے آئے ہیں

پھر موت کی آندھی اُٹھی ہے، پھر جنگ کے بادل چھائے ہیں

میں سوچ رہا ہوں اِن کا بھی اپنی ہی طرح انجام نہ ہو
اِن کا بھی جنوں ناکام نہ ہو
اِن کے بھی مقدّر میں لکھی، اک خون میں لتھڑی شام نہ ہو

سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

ہمارا پیار حوادث کی تاب لا نہ سکا
مگر اِنھیں تو مرادوں کی رات مل جائے
ہمیں تو کشمکشِ مرگِ بے اماں ہی ملی
اِنھیں تو جھومتی گاتی حیات مل جائے

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچّے تو قتل ہو جائیں
بہت دنوں سے ہے یہ خبط حکمرانوں کو
کہ دُور دُور کے ملکوں میں قحط ہو جائیں

بہت دنوں سے جوانی کے خواب ویراں ہیں
بہت دنوں سے محبّت پناہ ڈھونڈتی ہے
بہت دنوں سے ستم دیدہ شاہراہوں میں
نگارِ زیست کی عصمت پناہ ڈھونڈتی ہے

چلو کہ آج سبھی پائمال روحوں سے
کہیں کہ اپنے ہر اک زخم کو زباں کر لیں
ہمارا راز، ہمارا نہیں، سبھی کا ہے
چلو کہ سارے زمانے کو رازداں کر لیں

چلو کہ چل کے سیاسی مقامروں سے کہیں
کہ ہم کو جنگ و جدل کے چلن سے نفرت ہے
جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے
ہمیں حیات کے اس پیرہن سے نفرت ہے

کہو کہ اب کوئی قاتل اگر اِدھر آیا
تو ہر قدم پہ زمیں تنگ ہوتی جائے گی
ہر ایک موجِ ہوا رُخ بدل کے جھپٹے گی
ہر ایک شاخ رگِ سنگ ہوتی جائے گی

اٹھو کہ آج ہر اک جنگ جُو سے یہ کہہ دیں
کہ ہم کو کام کی خاطر کلوں کی حاجت ہے
ہمیں کسی کی زمیں چھیننے کا شوق نہیں
ہمیں تو اپنی زمیں پر ہلوں کی حاجت ہے

کہو کہ اب کوئی تاجر اِدھر کا رُخ نہ کرے
اب اس جگہ کوئی کنواری نہ بیچی جائے گی
یہ کھیت جاگ پڑے اٹھ کھڑی ہوئیں فصلیں
اب اِس جگہ کوئی کیاری نہ بیچی جائے گی

یہ سرزمین ہے گوتم کی اور نانک کی
اِس ارضِ پاک پہ وحشی نہ چل سکیں گے کبھی
ہمارا خون امانت ہے نسلِ نو کے لئے
ہمارے خون پہ لشکر نہ پل سکیں گے کبھی

کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں آسماں کی خیر نہیں

گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اِس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اِس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں